جنرل پرویز مشرف

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

1999ء کے اوائل بہار میں میرے انقرہ پہونچنے کے دن سے ہی میرے فوج کے اتاشی کرنل یعقوب مجھے متواتر یہ ''دھمکیاں'' دے رہے تھے کہ چیف، ترکی کے دورے پر اب آئے اور تب آئے۔

یہ ''دھمکیوں'' کی اصطلاح تو میں محض ازراہِ تفنن استعمال کر رہا ہوں ورنہ کرنل یعقوب تو بیچارے انتہائی نستعلیق، مرنجان مرنج انسان ہیں۔ اللہ انہیں عمر دے اور مزید ترقی دے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ اب تک میجر جنرل ہو چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ لیفٹیننٹ جنرل بھی ہو گئے ہوں۔ وہ مجھے سخت غیرفوجی لگتے تھے، اس لیے کہ ان میں وہ کوئی اکڑفوں نہیں تھی جو ہمارے وردی والوں کو عام انسانوں سے متمیز کرتی ہے۔ سیّدزادے ہیں، اس لئے میں ان کا احترام دل سے کرتا تھا اور اکثر ان سے مذاق میں کہا کرتا تھا کہ آپ کا آلِ سادات میں سے ہونا مجھ پر احترام کا فریضہ عائد کرتا ہے لیکن میں آپ کا مزید احترام یوں کرتا ہوں کہ کیا پتہ کسی دن مجھے آپ سے اسنادِ سفارت لینے پڑ جائیں کیونکہ ہمارے ہاں ایوانِ صدر کا راستہ تو فوجی ہیڈکوارٹر GHQ سے ہی ہو کر جاتا ہے اور بیچارے کرنل یعقوب میری پھبتی پر مارے شرم کے عرق ریز ہو جاتے تھے اور میں ان کی خجالت کو کم کرنے کے لیے پھر خود ہی ٹکڑا لگاتا تھا: ''لیکن ایسا ممکن نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آپ کے چیف آف آرمی اسٹاف بننے سے بہت پہلے میں ریٹائر ہو چکا ہوں گا''۔

جب بھی کرنل یعقوب میرے دفتر میں آ کر مجھے یہ مژدہ سنایا کرتے تھے کہ چیف اب فلاں تاریخ کو آنے والے ہیں تو میں ان کی ٹانگ کھینچنے کے لیے کہتا تھا: ''کرنل صاحب! آپ مجھ سے یہ توقع تو نہیں رکھیں گے کہ میں آپ کے چیف کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ بھی جاؤں گا''۔

اور جب وہ اثبات میں سر ہلاتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ مجھے جانا چاہیے تو میں جواب میں کہتا تھا: ''کرنل صاحب! سفیر کے لیے پروٹوکول یہ کہتا ہے کہ وہ ہوائی اڈے پر صرف صدرِ مملکت کا استقبال کرے گا یا وزیرِاعظم کا اور کسی کا نہیں اور میرا اور آپ کے چیف کا تو ایک ہی گریڈ ہے۔ وہ بھی 22 کے ہیں اور میں بھی''۔

اتفاق ہے کہ جنرل مشرف کے بطور چیف آف آرمی اسٹاف دورۂ ترکی کی تاریخیں تین چار بار طے ہوگئیں اور بوجوہ ٹل گئیں اور پھر جب وہ آئے تو چیف آف آرمی اسٹاف ہی نہیں تھے ملک کے چیف

ایگزیکٹو بھی ہو چکے تھے، لہٰذا مجھے ان کے استقبال کے لیے انقرہ کے ہوائی اڈے پر موجود رہنا پڑا۔
منتخب وزیرِاعظم کا تختہ الٹنے کے دس روز بعد ہی جنرل مشرف انقرہ تشریف لے آئے۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جب انہوں نے انتہائی ڈرامائی انداز میں حکومت پر قبضہ کیا تو میں اس وقت اپنی بیٹی کے پاس دہران (سعودی عرب) میں تھا اور بقول ان کے فضائی قزاقی (Hijacking) کا وہ سارا ڈرامہ جسے نواز شریف کے خلاف فردِ جرم عائد کرنے کے لیے جواز بنایا گیا، میں نے ٹی وی Live پر دیکھا تھا۔ بہرحال نئی حکومت آتے ہی مجھے اسلام آباد سے حکم ملا کہ فی الفور واپس انقرہ پہنچوں۔ اس لیے کہ ہنگامی حالات کا نفاذ ہو چکا تھا۔

انقرہ پہنچنے کے چار پانچ روز بعد ہی اسلام آباد سے مجھے بتایا گیا کہ چیف صاحب بلکہ چیف ایگزیکٹو صاحب ترکی کے دورہ پر انقرہ آنا چاہ رہے تھے اور صرف انقرہ میں ہی دو روز گزارنا چاہتے تھے۔ میں حیران تھا کہ انقرہ کا دورہ کرنے کی ایسی کیا جلدی تھی۔ ملک میں ہنگامی صورتحال تھی اور نئے سربراہِ مملکت اس ہنگامے کو چھوڑ کر انقرہ آرہے تھے، آخر کیوں؟

اسلام آباد سے تو ظاہر ہے میری کوئی رہنمائی نہیں ہوئی لیکن میں نے خود ہی دو جمع دو کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ جنرل صاحب شاید انقرہ کو اپنا وطنِ ثانی سمجھتے ہیں۔ آخر یہاں انہوں نے اپنے لڑکپن کے سات برس گزارے تھے جب ان کے والد بزرگوار مشرف الدین صاحب ہمارے سفارتخانے میں بطور اکاؤنٹینٹ کے تعینات تھے۔ جنرل مشرف تھوڑی بہت ترکی زبان بھی بول لیتے تھے اور پاکستان اور ترکی کے درمیان سب سے گہرا ناطہ دونوں افواج کا باہمی تعاون اور اشتراک تھا۔ سو جنرل مشرف غالباً اپنے ترک دوستوں اور حلیفوں سے شاباشی لینے کے لیے آرہے تھے کہ انہوں نے پاکستان کی ڈولتی اور بقول ان کے ڈوبتی ناؤ کو سہارا دیا تھا اور یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔

لیکن جنرل مشرف کے ترک میزبانوں کے نزدیک یہ ''کارنامہ'' نہیں بلکہ کارِ غلط تھا۔ جنرل مشرف جو دادِ تحسین لینے کے لیے انقرہ دوڑے چلے آئے تھے۔ ایسے وقت میں جب وہاں بلند ایجوت جیسا سوشلسٹ وزیرِاعظم تھا جس نے ترک جرنیلوں کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں جھیلی تھیں لیکن اپنے جمہوری نظریات پر کوئی سودے بازی نہیں کی تھی۔ صاف اس بات کا ثبوت تھا کہ جنرل مشرف گزشتہ چالیس برس کی ترک سیاست کے دھاروں کو جاننے اور سمجھنے کے معاملے میں بالکل کورے تھے۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۹۵ء تک 35 برس کے عرصے میں ترک فوج نے چار مرتبہ ملک کے جمہوری نظام میں مداخلت کر کے اسے تہہ و بالا کیا تھا۔ آخری بار جب ۱۹۹۵ء میں یہ بے جا مداخلت اور دراندازی ہوئی تو ملک کے مقبول اور مذہبی رجحان رکھنے والے مردِ مومن وزیرِاعظم نجم الدین اربکان کو وزارتِ عظمیٰ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور ان

کی جگہ جرنیل اپنی پسند کی وزیرِاعظم تنسو چلر کو لے کر آئے۔ یہی وہ دور تھا جب پاکستان میں بے نظیر وزیرِاعظم تھیں اور مغرب کے ذرائع ابلاغ بطورِ خاص اس بات کو بہت شہرت دیا کرتے تھے کہ ترکی اور پاکستان دونوں دوست ممالک میں وزارتِ عظمیٰ صنف نازک کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن مادام تنسو چلر سے بھی وزارتِ عظمیٰ کا بار ایسے ہی نہیں اٹھایا گیا جیسے ان کی ہم منصب سے پاکستان میں نہیں اٹھا۔

جنرل مشرف کی بدنصیبی کہ اس وقت کے صدرِ ترکی سلیمان دیمرل اور وزیرِاعظم بلند ایجوت دونوں ہی فوج کے ہاتھوں ڈسے ہوئے تھے۔ سو جب میں جنرل مشرف کو سلیمان دیمرل سے ملانے کے لیے قصرِ چنا کالے لے کر گیا تو دیمرل صاحب نے ان کا استقبال تو بہت خندہ پیشانی سے کیا لیکن جب بات چیت کا آغاز ہوا تو انہوں نے جنرل صاحب کو بقول شخصے بہت کھری کھری سنائیں، انہیں نیک و بد سمجھانے کے لیے۔

اس ملاقات میں جنرل مشرف تھے، میرے عزیز دوست اور اس وقت کے سکریٹری خارجہ شمشاد احمد تھے اور میں تھا اور کوئی نہیں تھا۔ دیمرل صاحب انگریزی بھی روانی سے بولتے تھے۔ اس لیے مترجم کی ضرورت بھی نہیں تھی لیکن ملاقات کی روداد Minutes ریکارڈ کرنے کے لیے ایک مترجم موجود ضرور تھا اور کوئی نہیں تھا۔

صدر دیمرل نے انتہائی تحمل اور بردباری سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: ''جنرل! مجھے عملی سیاست میں پچاس برس سے زیادہ ہو چکے ہیں اور اس طویل عرصے میں جس عمل نے میرے ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، وہ سیاست میں فوج کی مداخلت ہے۔ ہمارے جرنیلوں کے دماغ میں بھی یہ خنّاس تھا کہ وہ ملک کو سدھار سکتے ہیں لیکن ہر بار وہ جب اپنا تماشہ دکھا کے واپس بیرکوں میں گئے تو حالات پہلے کی بہ نسبت اور خراب کر کے گئے۔ جنرل! دنیا کی کوئی فوج کسی ملک کی تقدیر نہیں سنوار سکتی۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ مجھے پاکستان سے محبت ہے اور تمہیں میں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں، لہٰذا بڑا بھائی ہونے کے ناطے میرا مشورہ یہ ہے کہ جتنی جلد ہو سکے، اقتدار سیاستدانوں کو واپس کرو اور اپنی بیرکوں کو لوٹ جاؤ''۔

میں دیکھ رہا تھا کہ جنرل مشرف کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ وہ کیا سوچ کر آئے تھے اور ماجرا کیا ہوا۔ دیمرل صاحب نے تو ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شاباشی دینے کے بجائے کان مروڑ دیئے۔

ملاقات ختم ہونے پر باہر نکلے تو مجھ سے اور شمشاد سے فرمایا: ''یہ صدر دیمرل کچھ زیادہ ہی نہیں کہہ گئے؟''۔

شمشاد تو خاموش رہے لیکن میں نے جواب میں اتنا ضرور کہا: ''جنرل صاحب! دیمرل فوج کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہیں۔ زک اٹھا چکے ہیں۔ اس لیے اپنا تجربہ بیان کر رہے تھے''۔

وہاں سے اگلی ملاقات کے لیے وزیراعظم بلند ایجوت کے دفتر پہنچے تو ایجوت صاحب الگ چھریاں تیز کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سلیمان دیمرل کے مقابلے میں فوج کے بہت زیادہ ڈسے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ دائیں بازو کے رجحانات رکھنے والوں کے نزدیک ایجوت کا گناہ در گناہ یہ تھا کہ وہ کٹر سوشلسٹ نظریات کے حامل تھے اور ان کے سوشلزم میں صرف زبانی جمع خرچ نہیں تھا۔ وہ ہمارے قائدِ عوام، ذوالفقار علی بھٹو کی طرح کے سوشلسٹ نہیں تھے کہ رہن سہن، رکھ رکھاؤ، سب بادشاہوں کا سا لیکن زبان پر سوشلزم کے پرفریب نعرے۔ ایجوت وزیراعظم ایک بار نہیں تین بار بنے تھے لیکن میں دیکھتا تھا کہ وہ اپنے تیسرے عہد وزارت میں بھی، جب میں وہاں تھا، کبھی ایک دن بھی وزیراعظم کی شاندار سرکاری رہائش گاہ میں نہیں رہے۔ وہی اپنے تین کمروں کے پرانے فلیٹ میں رہتے تھے اور وہی بیس برس پرانی فیاٹ (Fiat) گاڑی خود چلاتے تھے جسے وزیراعظم تو کجا ہمارے ایکس گریڈ کے افسر بھی کھٹارا کہہ کر کب کے ٹھکانے لگا چکے ہوتے۔ جنرل مشرف کو اپنے مختصر قیام انقرہ کے دوران شاید میرا وہ جملہ بہت ناگوار گزرا تھا جب وہ میرے سامنے پاکستان اور ترک افواج کے درمیان مشترک اقدار گنوا رہے تھے اور میں نے ان کی تقریر سننے کے بعد کہا تھا: ''جنرل صاحب! یہ مماثلات اپنی جگہ درست لیکن پھر بھی ایک بہت بڑا فرق ہے دونوں افواج کے کردار میں اور وہ یہ کہ ترکی کے کسی شہر میں آپ کو پاکستان کی طرح ڈیفنس کالونی نہیں ملے گی۔ یہاں فوج کا سربراہ اعلیٰ یعنی آپ کا ہم منصب بھی جب ریٹائر ہوتا ہے تو تین چار کمروں سے زیادہ کے فلیٹ میں نہیں رہتا ہے۔ اس لیے کہ سرکار اسے نہ کوئی مراعات دیتی ہے اور نہ ہی زمینیں۔

سو بلند ایجوت نے تو جنرل مشرف کو اور بھی آڑے ہاتھوں لیا اور ان تمام نقصانات کی فہرست گنوائی جو سیاسی عمل میں فوج کی مداخلتِ بے جا سے ترکی میں پیدا ہوئے تھے اور بقول ان کے دنیا کے ہر اس ملک میں ہو سکتے تھے اور ہوئے تھے، جہاں فوج اپنے ڈنڈے کی حکمرانی زبردستی مسلّط کرتی ہو۔

ایجوت صاحب نے تو ایک مرحلے پر تفریح لینے کے لیے جنرل مشرف سے کہا: جنرل! ہمارے دونوں ملکوں میں بہت سی اقدار مشترک ہیں اور اب تو ہم اس اسکور میں بھی برابر ہو گئے کہ دونوں جگہ جرنیلوں نے چار بار سیاسی عمل میں رخنہ ڈالا ہے۔

ایجوت کے اس سنگین مذاق پر جنرل مشرف کا منہ لٹک گیا لیکن کیا کرتے بات بالکل درست تھی، لہٰذا کڑوی کسیلی گولی نگلنی پڑی۔ یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ ترک انہیں گھر بلا کر جھاڑ پھٹکار رہے تھے۔ اس لیے کہ موصوف تو خود ہی ترکی دوڑے آئے تھے۔

جہاں تک جنرل مشرف کی ذات کا تعلق تھا ترک رہنماؤں نے انہیں ایک معزز پاکستانی ہونے کے ناطے سے اسی طرح خوش آمدید کہا تھا جیسے وہ ہمیشہ کھلے دل اور خلوص نیت کے ساتھ پاکستانیوں کو

سینے سے لگاتے رہے ہیں لیکن جس حیثیت میں اور پاکستان میں ایک منتخب جمہوری حکومت کا بزورِ شمشیر تختہ الٹنے کے بعد وہ ایک عسکری آمرِ مطلق کے روپ میں ترکی میں وارد ہوئے تھے وہ ترکی کی جمہوری قیادت کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ سو میں نہ چاہنے کے باوجود یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا کہ ان کا اوّلین بیرونی دورہ پاکستان کے بزعم خودنجات دہندہ کے طور پر ان کے لیے بھی اور پاکستان کے لیے بھی ایک دھچکا تھا۔ سفارت کی زبان اور اصطلاح میں ہم ایسے اقدام کو Faux Pas کہتے ہیں۔

لیکن ترک ذرائع ابلاغ نے ان کے دورہ کو چشم ماروشن، دل ماشاد کہہ کر قبول کیا اور پذیرائی بخشی۔

جنرل مشرف کے ان کلمات نے جو انہوں نے انقرہ کے ہوائی مستقر پر اپنی آمد کے فوراً بعد ادا کیے کہ جدید ترکی کے بانی اور ترکوں کے باپ اتاترک ان کے لیے رول ماڈل تھے، لائقِ تقلید تھے۔ ترک صحافیوں اور میڈیا پنڈتوں کے دل جیت لیے اور انہوں نے دل کھول کر جنرل مشرف کو داد دی کہ انہوں نے اپنے لیے مثالی شخصیت اس ہستی کو چنا تھا جس کی ترک پرستش کرتے تھے۔

لیکن مجھے اندازہ تھا کہ پاکستان کے رجعت پسند مذہبی حلقے ان کے اس انتخاب کو ہرگز پسند نہیں کریں گے اور انہیں آڑے ہاتھوں لیں گے۔ اس لیے کہ کٹر مذہبی عقائد اور نظریات کے حامل پاکستانی، کمال اتاترک کو پسندیدگی کی نظر سے اس لیے نہیں دیکھتے تھے کہ سامراجیوں اور استعمار پسندوں کی یلغار کا رخ موڑ دینے کے بعد جب اتاترک نے جدید ترکی کی بنیادیں ڈالیں تو عثمانیوں کے دور کے مذہبی رہنماء، علماء اور مفتی ان کا خصوصی ہدف بنے اور اتاترک نے کسی رورعایت کے بغیر ان حلقوں کی بیخ کنی کی۔ اس لیے کہ ان کی اپنی دانست میں خلافت عثمانیہ کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری ان دقیانوسی علماء کے سر جاتی تھی۔

لیکن اتاترک نے صرف علماء اور مفتیوں کا زور ہی نہیں توڑا بلکہ ان کا نزلہ تو خلافت کے صدیوں پرانے ادارہ پر بھی گرا اور انہوں نے بہ یک جنبشِ قلم ۱۹۲۳ء میں جدید ترکی کی جمہوری بنیادیں رکھنے کے ساتھ ہی خلافت عثمانیہ کو بھی بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔

خلافت کی بربادی بلکہ انہدام کا شاید ترکوں نے اتنا اثر نہ لیا ہو جتنا ہندوستان کے مسلمانوں نے لیا اور ان کی مایوسی اور فکری انتشار کا باعث یہ حقیقت تھی کہ مسلمانانِ ہند نے تو ایک طویل عرصہ تک خلافت کی حمایت اور برطانوی اور یورپی استعمار کے خلاف ایک منظم مہم چلائی تھی جس میں سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے اور برطانوی سرکار کو دیوار سے لگانے کے لیے ''مہاتما گاندھی'' بھی شریک ہو گئے تھے۔

مسلمانانِ ہند نے اپنی غربت اور پسماندگی کے باوجود ترکوں کی امداد کے لیے پورے برصغیر میں کوچہ کوچہ اور قریہ قریہ پھر کر پیسہ جمع کیا تھا لیکن ستم ظریفی کہ جب لاکھوں کی یہ رقم لے کر ڈاکٹر مختار انصاری

کی قیادت میں مسلمانانِ ہند کا وفد ترکی پہنچا تو خلافت کی بساط الٹ چکی تھی اور خلافتِ عثمانیہ اور بہت سی پارینہ داستانوں کے جلو میں تاریخ کی امانت بن گئی تھی۔

لیکن جب میں پہلی بار ترکی کے مرکزی بینک جو ہمارے اسٹیٹ بینک کی طرح کا ادارہ ہے، کے گورنر سے ملنے گیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ہندوستانی مسلمان جب لاکھوں روپے کے عطیات لے کر انقرہ پہنچے تو کمال اتاترک نے ان کے جذبہ اخوت اور ترک مسلمانوں کے لیے ان کی پرخلوص حمایت کو سراہتے ہوئے حکم دیا کہ ملّت بینک کے تاسیسی فنڈز میں جو ان دنوں اپنی تاسیس کے مرحلہ میں تھا، مسلمانانِ ہند کے اس فیاض عطیہ کو شامل کیا جائے۔ سو ملّت بینک کی بنیادوں میں ہمارے آباو اجداد کے گاڑھے پسینے کی کمائی بھی شامل ہے اور ترک رہنما جو تاریخ سے واقف ہیں، آج بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی اس بے مثال قربانی کا ذکر احسان مندی کے ساتھ کرتے ہیں۔

سو جب میں نے جنرل مشرف سے اپنے تحفظات کا اظہار کیا کہ پاکستان کے مذہبی اور وہ سیاسی حلقے جو مذہب کی بنیاد پر قائم ہیں، ان کے اتاترک کے لیے دادِ تحسین کے کلمات کو ہدفِ تنقید بنائیں گے تو انہوں نے کمال بے اعتنائی سے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا کہ انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

اور دیکھا جائے تو اپنے آٹھ ساڑھے آٹھ برس پر محیط دورِ آمریت میں جنرل مشرف نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ کسی کو خاطر میں نہیں لائے۔ یوں لگتا تھا جیسے پاکستانیوں کو انہوں نے کسی کمانڈو آپریشن میں فتح کیا تھا اور انہیں پورا حق تھا کہ اپنے مفتوحہ علاقے کے ساتھ اور اس کے بسنے والوں کے ساتھ جو چاہیں سلوک کر سکتے ہیں۔

لیکن انقرہ میں ان کے ساتھ دو دن گزارنے کے دوران میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ مطلق العنانی میں پاکستان کے ہر عسکری اور غیر عسکری آمر کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔

پاکستان کے متعلق انہوں نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں، کرید کرید کر سوالات کیے۔ یہ کہہ کر کہ انہیں بتایا گیا تھا کہ میرا شمار دفترِ خارجہ کے سب سے زیادہ باخبر اور ذہین افسروں میں ہوتا تھا اور میں نے حتی الامکان ان کے ہر سوال کا جواب وضاحت سے دیا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ انہیں میرا جواب اچھا لگے گا یا برا۔

ایک سوال جو انہوں نے بطور خاص مجھ سے کیا، وہ من وعن وہی تھا جو چند مہینے پہلے اس شخص نے کیا تھا جسے معزول اور مطعون کر کے مشرف صاحب نے اقتدار کی مسند سنبھالی تھی۔ پوچھنے لگے کہ آپ کے خیال میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟

میں نے عرض کیا: جنرل صاحب! مجھ سے یہی سوال آج سے تین مہینے قبل میاں نواز شریف نے بھی کیا تھا اور جو جواب میں نے انہیں دیا تھا وہی میں آپ کی خدمت میں بھی پیش کر دیتا ہوں۔ میری

ناقص رائے میں پاکستان کے مسائل کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک سکہ ہے جس کے دو رخ ہیں اور دونوں مساوی اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلا رخ اس سکے کا ہماری سیاست اور سیاسی کلچر میں جاگیرداروں اور وڈیروں کا تسلط ہے۔ یہ طبقہ جسے صرف اور صرف اپنے مفاد سے محبت ہے اور اپنی غرض ہی ان کو عزیز ہے، ملک چاہے جائے بھاڑ چولہے میں، جونک کی طرح ہمارے سیاسی نظام سے چمٹا ہوا ہے اور اس کا خون چوس رہا ہے۔ دوسرا رخ اس سکے کا ہمارے ہاں روزافزوں بڑھتی ہوئی جہالت اور تعلیم کی کمی ہے۔ بدقسمتی ہے کہ پاکستان کا شمار معدودے ان گنتی کے چند ممالک میں ہوتا ہے جہاں ان پڑھ لوگوں کی شرح ہر سال بڑھ رہی ہے۔ اس لیے کہ جس تیزی سے ہماری آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے، ملک میں تعلیم و تدریس کی سہولتیں اس رفتار کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اگر پاکستان کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ملک کی تقدیر کو بدلنا چاہتے ہیں تو اس سکے کو توڑ دیجیے۔ سیاست پر جاگیردارانہ تسلط کو ختم کر دیجیے اور جہالت کا گلا گھونٹ دیجیے، تعلیم پر خاطر خواہ توجہ کے ذریعے۔

جنرل مشرف نے میری معروضات سننے کے بعد فرمایا: ''آپ کی باتوں میں بہت وزن ہے۔ مجھے آپ کی تجاویز سے اتفاق ہے۔ تعلیم کا تو کوئی مسئلہ نہیں، ہم اس کے لیے بجٹ بڑھا سکتے ہیں لیکن جاگیرداروں اور وڈیروں کو سیاست سے کیسے دور رکھا جا سکتا ہے؟''

میں نے کہا: ''جنرل صاحب! دنیا آپ پر ڈکٹیٹر ہونے کی چھاپ تو ان آٹھ دس دن میں ہی لگا چکی ہے اور جتنے عرصے آپ پاکستان کی باگ ڈور سنبھالے رہیں گے، یہ لیبل آپ پر مزید چسپاں ہوتا رہے گا لیکن اگر آپ واقعی ملک اور قوم کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں تو کڑوی گولی ہی نہیں بلکہ کڑوی گولیاں نگلنی پڑیں گی۔ آپ نے کمال اتاترک کو اپنے لیے رول ماڈل قرار دیا ہے تو پھر آپ ان کی تقلید ہی کر لیجیے۔ اتاترک میں بہت سی خامیاں تھیں۔ بہت سے عیب تھے لیکن ایک بہت بڑی صفت تھی۔ وہ جوہر اس رہنما میں ہوتی ہے اور ہونی چاہیے جنہیں اپنی قوم کی تقدیر بدلنے کا دعویٰ ہوتا ہے۔ اتاترک نے جو کام کرنے کا فیصلہ کیا، پھر اس کے متعلق نہ اپنے ذہن میں کوئی ابہام رہنے دیا اور نہ اپنی قوم کو کسی مغالطہ میں رکھا۔ بس جو قوم کے لیے بہتر سمجھا وہ کر گزرے۔ یہی صفت ماؤزے تنگ میں بھی تھی۔ عوامی انقلاب کی فتح کے بعد ماؤ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جاگیرداروں اور زمینداروں کا قلع قمع کر دیا۔ اس لیے کہ یہ صرف ماؤ کا وہم ہی نہیں تھا بلکہ وہ لوگ چینی عوام اور قوم کے مفادات کے بدترین دشمن تھے۔ امام خمینی نے بھی ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ان شاہ پرستوں اور استحصال پسندوں کو جنہوں نے ایران کے غریب عوام کا جینا دوبھر کر رکھا تھا، تہِ تیغ کروا دیا۔ یہ کہہ کر کہ یہ لوگ انسانیت کے دشمن

ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ لوگ ایرانی عوام کے دوست نہیں تھے"۔ جنرل صاحب نے لقمہ دیا: "لیکن پاکستان میں یہ کام کیسے ہوسکتا ہے؟"۔

میں نے کہا: "جنرل صاحب! نیت ہو تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک فارمولا ہے اور وہ یہ کہ آپ ۱۹۷۱ء کے سقوطِ ڈھاکہ کو خطِ تنسیخ قرار دیجیے۔ وہ جسے انگریزی میں Watershed کہتے ہیں۔ پاکستان اس سانحہ کے نتیجے میں دولخت ہوگیا تھا۔ یہ فیصلہ تو آج تک نہیں ہوسکا کہ اس کی ذمہ داری کس پر تھی لیکن عوام کی عدالت میں پاکستانی سیاستدانوں کی کھلی ناکامی ایک بڑی وجہ تھی جو ملک کے ٹکڑے ہوئے اور قائداعظم کا پاکستان منتشر ہوگیا۔ آپ یہ حکم نافذ کر دیجیے کہ سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے جو لوگ بھی پاکستان کی قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے رکن تھے، وہ اور ان کے بیٹے، بھتیجے، داماد وغیرہ وغیرہ آئندہ بیس برس کے لیے عملی سیاست میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہوں گے۔ بیس برس میں کم از کم چار الیکشن ہوچکے ہوں گے اور اس عمل کے نتیجے میں نہ صرف پرانے جغادری اور کھلاڑی پاکستان کے سیاسی منظرنامے سے مٹ چکے ہوں گے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی اور متبادل قیادت قوم سے اپنا وجود منوا چکی ہوگی۔ کہیے کیسی لگی یہ تجویز؟"

جنرل صاحب نے کہا: "بات دل کو لگتی ہے لیکن میں تنہا یہ فیصلہ نہیں کرسکتا۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا ہوگا"۔

ان کا یہ کہنا اس بات کا غماز تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ان کے ساتھی تو اپنی ناک کے آگے دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہوں گے۔ ان کے لیے تو واحد ہدف یہ ہوگا کہ کس طرح سیاسی منظرنامے میں اپنا رنگ بھرا جائے۔ میدانِ اقتدار میں اپنی ایڑیاں مضبوطی سے جمائی جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے اقتدار کو کیسے جائز منوایا جائے، بالکل ایسے ہی جیسے پاکستان کے کرپٹ معاشرہ میں نوسرباز اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے منی لانڈرنگ (Money Laundering) کے نت نئے حربے آزماتے رہتے ہیں۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ ملک کی سیاست اور سیاسی عمل پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ہر فوجی آمر نے جاگیرداروں اور وڈیروں کو شریکِ اقتدار کیا تھا، اس لیے کہ اقتدار کے بھوکے یہ جاگیردار اپنی قیمت لگوانے میں کسی اخلاقی ضابطے یا اصول کے اسیر نہیں ہوتے جو ان کی مانگ پوری کردے اور انہیں لوٹ مار کرنے کے لیے اپنی سرپرستی فراہم کردے۔ وہ اس کے ساتھ شریک بھی ہوجاتے ہیں اور اس کے ہاتھ بھی مضبوط کرنے کے لیے کوشاں ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا صرف ایک ہدف اور ایک اصولِ حیات ہے کہ خود بھی کھاؤ اور دوسرے کو بھی کھانے دو۔ بندر بانٹ کی مثل پاکستانی اہلِ سیاست پر خوب صادق آتی ہے۔

جنرل مشرف نے آنے والے برسوں میں بھی وہی کچھ کیا جو ان سے پہلے ان کے تین عدد عسکری

طالع آزما کر چکے تھے بلکہ انہوں نے توان سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کراوچھی اوراول جلول حرکتیں کیں۔ وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے۔ میرا ماتھا توان کے اس ایک جملے کوسن کرہی ٹھنکا تھا کہ انہیں کسی کی پرواہ نہیں ہے لیکن ہے۔ انہیں ایک پرواہ ضرور تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے وہ لیلائے اقتدار کی زلفوں سے کھیلتے رہیں اور آٹھ سال سے زیادہ عرصے تک ان زلفوں کے اسیر رہتے ہوئے انہوں نے پاکستان کے اداروں کی جس طرح جڑیں کھودیں وہ آمریت کی سیاہ تاریخ میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔

میرے گھر کی لائبریری میں کتابوں سے بھری الماریاں دیکھ کر جنرل مشرف نے مجھ سے پوچھا ''یہ آپ اتنی ساری کتابیں پڑھتے ہیں؟''

میں نے عرض کیا: ''پڑھتا نہ ہوتا تو رکھتا ہی کیوں۔ میں نے تو آنکھ کھول کراپنے گھر میں کتابیں ہی دیکھی تھیں۔ سوآج تک یہ حال ہے کہ رات میں سونے سے پہلے اگر کتاب نہ پڑھوں تو نیند نہیں آتی''۔

فرمانے لگے: ''مجھے پڑھنے کا شوق نہیں۔ البتہ میری والدہ کو کتابوں سے عشق ہے''۔ پھر فرمایا ''آپ اور آپ کی بیگم تو دونوں شاعر ہیں۔ میری والدہ کو بھی شاعری سے اور موسیقی سے بہت لگاؤ ہے۔ آپ اپنی کتابیں مجھے دیجیے، میں ان کے لیے لے جاؤں گا''۔

میں نے حسبِ فرمائش اپنی اور اپنی شاعرہ شریکِ حیات اور شریکِ فن کی کئی کتابیں جو شاعری کے مجموعے تھے، ان کی والدہ کے لیے نذر کر دیئے۔ اس کی داد دینی چاہیے کہ اسلام آباد واپس پہنچ کر جنرل صاحب نے کتابوں کے لیے مجھے شکریہ کا خط بھیجا۔

دورانِ گفتگو یہ بھید بھی کھلا کہ دلّی کے دریا گنج میں جہاں میرے ابا مرحوم کی محنت سے بنایا ہوا مکان تھا، جس میں میں پیدا ہوا تھا، وہیں ہمارے گھر سے بہت قریب جنرل مشرف کے آباء کی حویلی بھی تھی۔ مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے سے پہلے یہ تو علم تھا کہ وہ بھی دلّی والے ہیں لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ ان کے اور میرے آباء کے محلوں میں اتنی قربت تھی۔

ویسے جنرل مشرف کا کرخت اور پنجاب مارکہ لہجہ سننے کے بعد میں ان سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ان کے لہجہ سے تو کوئی یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا تعلق دلّی سے تھا۔ انہوں نے اس کا برا نہیں مانا بلکہ کھسیانے ہو کر کہنے لگے: ''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میرا لب ولہجہ تو فوج میں رہ کر بگڑ گیا لیکن میری والدہ کا لہجہ اور زبان آج بھی دلّی والوں جیسے ہیں''۔ اور مجھے احساس ہوا کہ ان کے لیے ان کی والدہ رول ماڈل اور آئیڈیل تھیں۔ انہوں نے شاید اپنی خودنوشت میں بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

جنرل مشرف کے رخصت ہو جانے کے بعد میرے لیے ان کے والد مشرف صاحب کے مقام اور منصب کے سلسلہ میں بڑی مشکل پیدا ہوگئی۔ اخبار والے، آپ جانیں دو جمع دو کرنے کے ماہر ہوتے

ہیں۔ انہیں اپنی کہانی کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے اور اس کے لیے حاشیہ آرائی ایک آسان نسخہ ہے۔ سو اخبار والوں نے سوچا کہ بیٹا پاکستان کا چیف ایگزیکٹو اور بے تاج بادشاہ ہو گیا ہے تو باپ کم از کم انقرہ میں پاکستان کا سفیر تو ضرور رہا ہوگا۔ پدرم سلطان بود ویسے بھی ہم مسلمانوں کی کمزوری ہے۔ سو جنرل صاحب کے دورہ کے بعد میرے پاس صحافیوں اور کالم نگاروں کے فون آنا شروع ہوئے۔ ان کی دلچسپی یہ جاننے میں تھی کہ جنرل مشرف کے والد کس زمانے میں آپ کے پیشرو تھے؟ انہوں نے سفارت کتنے برس کی؟

میں نے سوچا، اگر میں حقیقت بیان کر دوں اور کہوں کہ وہ تو محض ایک کلرک تھے جسے سفارتخانے کے حساب کتاب کی ذمہ داری سونپی گئی تھی تو سبکی کی بات ہوگی۔ سو میں نے اخبار والوں کی تسلی کے لیے یہ اصطلاح ایجاد کی کہ مشرف صاحب ہمارے سفارتخانے کے اکاؤنٹس منیجر تھے۔ منیجر کی اضافت کارگر رہی اور اپنی عزت رہ گئی۔

مشرف الدین صاحب اور بالواسطہ ان کے پسر بے مہار کی عزت کا بھرم تو میں نے رکھ لیا لیکن جنرل مشرف نے نہ اس منصب کا بھرم رکھا جو کاتب تقدیر نے ان کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور نہ ہی یہ سوچا کہ پاکستان کے اداروں اور ریاست کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کو کمزور کر کے وہ ارضِ وطن اور اہالیان وطن پر کیا ستم ڈھا رہے ہیں۔

مجھے جنرل مشرف سے کبھی کوئی ذاتی عناد یا اختلاف نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو میں نے صرف دو دن قریب سے دیکھا ہو اس سے ذاتی اختلاف یا پرخاش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہت سے احباب نے یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ میرے اور جنرل مشرف کے مابین شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے میں نے اپنی مدت ملازمت ختم ہونے سے ڈیڑھ برس پہلے ہی قبل از وقت ریٹائرمنٹ اور طویل رخصت پر چلا جانا قبول کیا تھا لیکن میں نے یہ قدم محض ذاتی وجوہ کی بنیاد پر اٹھایا تھا۔ جنرل مشرف کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا کہ دفتر خارجہ سے میرے نام افلاطونی حکم آیا کہ واپس اسلام آباد چلے آؤ۔ اس لیے کہ تمہیں باہر سفارت کرتے ہوئے بارہ برس سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا، بارہ برس تو ضرور ہو گئے ہیں لیکن یہاں ترکی میں تو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا اور کیا اس نزاکت پر غور کیا گیا ہے کہ ترکی جیسے قریبی اور عزیز دوست سے ایک پیشہ ور سفارتکار سفیر کو بلاجواز تبدیل کر دینا باہمی تعلقات کے لیے کیسا برا شگون ہوگا؟

لیکن جہاں مشرف کے زیرسایہ دفتر خارجہ پر خوارج کا قبضہ ہو چکا تھا، میری کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ بات اصل میں یہ تھی کہ جنرل مشرف کے دست راست اور نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں ان کے شریک کار جنرل عزیز اپنے ایک ''گرائیں'' کو انقرہ میں سفیر لگوانا چاہتے تھے۔ یہ صاحب

شاید کوکا کولا کے کسی بوٹلنگ کے کارخانے میں منیجر ہوا کرتے تھے لیکن راتوں رات دفترِ خارجہ میں بھرتی ہو گئے اور انقرہ میں سفیر بننے کی خواہش ان کے دل میں کونپل کی طرح پھوٹ نکلی۔ اب ظاہر ہے کہ میں ایک سیاسی یتیم جو اپنے کنبے میں واحد بیوروکریٹ ہونے کی سزا بھگت رہا تھا، جنرل عزیز کے گرائیں کے سامنے کیسے ٹھہر سکتا تھا۔

میں نے جنرل عزیز جیسا منافق بھی نہیں دیکھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں نے بحیثیت سفیر کے انقرہ میں جو پہلی ضیافت دی، اس کے مہمانِ خصوصی جنرل عزیز تھے جو انقرہ میں ایک فوجی وفد کے قائد بن کر آئے ہوئے تھے اور پندرہ ماہ بعد جب میں نے آخری ضیافت دی تو اس کے مہمان خصوصی بھی یہی ذات شریف تھے۔ میں نے جب ان سے یہ ماجرا بیان کیا کہ دفترِ خارجہ میرے ساتھ زیادتی کر رہا ہے اور مجھے انقرہ میں مزید دو مہینے دینے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہے تو کمال معصومیت سے میرے ساتھ ہمدردی جتاتے ہوئے فرمایا: ''ہمارے ہاں فوج میں یہ نہیں ہوتا کہ ہم سینئر افسروں کی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں۔ آپ کے ساتھ واقعی زیادتی ہو رہی ہے''۔ لیکن میرے فرشتوں کو بھی اس کی بھنک اس وقت نہیں تھی، اس ساری روداد سازش کا تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ یہی ذاتِ شریف اس ٹولے کے سرغنہ تھے جو اندر ہی اندر میری جڑیں کاٹ رہا تھا۔

نواز شریف کا تختہ الٹنے کی سازش میری دانست میں اس دن سے بنی شروع ہو گئی تھی جب مشرف اور عزیز کا کارگل کے لیے بنایا ہوا منصوبہ الٹی آنتوں کی طرح ان کے اور پاکستان کے گلے پڑنے لگا تھا۔ نواز شریف کو ان سازشیوں نے تاریکی میں رکھا تھا اور ان کی پیٹھ کے پیچھے ساری کھچڑی پکائی گئی تھی۔ مشرف کو تو بقول ان کے کسی کی پرواہ تھی ہی نہیں، لہٰذا وزیراعظم کو وہ کہاں گردانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کارگل کی کامیابی کی صورت میں وہ قوم کے ہیرو بن جائیں گے اور ناکامی کا طوق وہ بہ آسانی نواز شریف کے گلے میں ڈال دیں گے اور انہوں نے یہی کیا بھی۔ ہوائی جہاز کی ہائی جیکنگ کا تو ڈرامہ رچایا گیا تھا ورنہ جہاز کو کراچی کے ڈرگ روڈ (شارعِ فیصل) یا ماری پور ایئر بیس میں سے کسی بھی ایک جگہ اتارا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ یہ دونوں ہوائی اڈے ایئر فورس کی تحویل میں تھے لیکن اگر یہ ہو جاتا تو پھر نواز شریف کو مطعون کرنے کا منصوبہ کیسے منڈھے چڑھتا۔

میں نے انقرہ میں جنرل مشرف سے سوال کیا تھا کہ آخر جہاز کو ماری پور یا ڈرگ روڈ پر کیوں نہیں اتارا گیا اور جواب میں انہوں نے آئیں بائیں شائیں کر کے مجھے ٹالنے کی کوشش کی اور میں یہ سوچ کر مزید بحث میں نہیں پڑا تھا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، لہٰذا وہ اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

جنرل مشرف کا مقدمہ ابھی تمام نہیں ہوا۔ ان کا فائل تاحال کھلا ہوا ہے لیکن میری ذاتی رائے میں

پاکستان کے کسی آمر اور طالع آزما نے ملک وقوم کی ذلت اور رسوائی کا ایسا سامان نہیں کیا جیسا مشرف نے کیا۔ اپنی ہوس اقتدار کی تسکین کے لیے انہوں نے پورے ملک کو سامراج کے ہاتھوں گروی رکھ دیا اور ملک کی غلامی کا وہ بدترین دور آج تک جاری ہے اور نہ جانے ابھی کتنے برس اور جاری رہے گا۔

مجھے حیرت تو ان لوگوں پر ہوتی ہے جو آج بھی ریاست کے ستونوں کو کمزور کرنے والے اس بدمست آمر کی واپسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ قدیم یونانیوں کے ہاں ایک محاورہ زبان زدعام تھا کہ دیوتا جس قوم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں اس کے لوگوں کو پہلے پاگل بنا دیتے ہیں۔ مشرف کے حاشیہ بردار اور کھاتے دار بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔